کرشن چندر کے ناولوں میں سیاسی مباحث

محمد ثقلین، لیکچرر، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ تعلیم الاسلام کالج، چناب نگر

Abstract

In this article, the novels of Karishan Chander are discussed in his contemporary political perpective. He has touched politics in his fiction in different ways and prepartition and post partition circumstances has been picturised.

کرشن چندر ۲۳ نومبر ۱۹۱۳ء کو بھرت پور راجستھان میں پیدا ہوئے جہاں اُن کے والد میڈیکل افسر کے طور پر ملازم تھے۔

کرشن چندر کی اشتراکیت نے انہیں بہت مقبول بنا دیا۔ روس کی چوتھی ادبی کانگریس مئی ۱۹۶۷ء میں منعقد ہوئی جس میں چین کے سوا سبھی ملکوں نے شرکت کی ہندوستان میں دس بارہ ادیبوں پر مشتمل ایک وفد دہلی سے ماسکو روانہ ہوا جس میں بنگالی، مراٹھی، گجراتی، ہندی، تامل، تیلگو، کنٹر کے ادیبوں نے شرکت اختیار کی۔ پاکستان سے فیض احمد فیض بھی شریک ہوئے کانگریس کا یہ اجلاس کریملن میں کئی دن تک جاری رہا۔ کرشن چندر یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوئے کہ کانگریس کا تمام تر انتظام اور کاروائی وہاں کے ادیبوں کے ہاتھ میں تھی ہمارے یہاں کے برعکس سیاست دانوں کا عمل دخل نہ تھا۔ اس کانفرنس میں کرشن چندر نے چوٹی کے اشتراکی ادیبوں اور دانشوروں سے ملنے کا موقع ملا۔ کانفرنس میں جرمن مصنفہ اینا سیگھرز اور افریقی شاعر ایلکسی لگونا شامل ہوئے، چلی کا شاعر پابلو نرودا انگریز ادیب لارڈ سنوڈن پاکستان کے شاعر فیض احمد فیض تاشقند کی مادام جُو لفیا بھی موجود تھے۔

کرشن چندر پامال، پسماندہ اور محنت کش عوام کے حقوق کے پاسبان اور نگہبان تھے وہ اپنے ادب اور ترقی پسند ادیبوں کی مجالس میں سماج کے بھوکے ننگے لوگوں کے دکھ درد کو نمایاں کرتے رہے اور اُن کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہے لیکن اگر اُن کی نجی زندگی پر نظر ڈالیں تو اُن کے محنت کش عوام کے نمائندہ ہونے کی جھلک کہیں نہیں ملتی۔ کرشن چندر ایک انقلابی ادیب کے طور پر غیر جمہوری، غیر انسانی، غیر اخلاقی اقدام کے خلاف نبرد آزما رہے۔ جہاں بھی عوام جبر و تشدد کا نشانہ بنتے اور جہاں بھی اُن کے حقوق کا استحصال ہوتا ان کی صدائے احتجاج بلند ہو جاتی مگر اندرا گاندھی کے دور میں انہوں نے عوام کی بجائے حکومت کے ترازو اپنا ووٹ ڈالا۔ کرشن کے سیاسی عقیدے کے بارے میں بھی کافی تضاد موجود ہے وہ آفاقی ہمدردیاں رکھنے والے عالمی امن، صلح اور آشتی کے علمبردار رہے اور اِس تعلق سے امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظام کی سامراجیت، جارحیّت اور توسیع پسندانہ پالیسیوں کے بھی دشمن رہے۔ امریکہ نے جب دیت نام کو اپنی جارحیت کا شکار بنایا تو اُن کا قلم فوراً حرکت میں آیا اور انہوں نے

بساط بھر امریکہ کو خوب لتاڑا اور یہ بجا بھی تھا درحقیقت جب بھی کوئی ملک جارحیت یا استحصال کا شکار ہوتا ہے اُن کی صدائے احتجاج فوراً بلند ہو جاتی ہے اور یہ خصوصیت ان کے فن کا جذوِ لاینفک بن گئی تھی لیکن روس کی ہنگری اور چیکوسلوا کیہ میں مداخلت پر کرشن چندر خاموش رہے۔

کرشن چندر ہمیشہ سرمایہ داری، ملوکیت اور فسطائیت کے مخالف رہے اور ایسے سیاسی نظام کی خواہش اُن کے اندر ہمیشہ مچلتی رہتی جہاں انسانیت کی قدر ہوتی ہو۔

ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''کرشن چندر کو اشتراکیت کے اِس دور کے اس نئے نظام کی صبح کا انتظار ہے جس کی ضیا پوش کرنوں میں سرمایہ داری، ملوکیت پرستی اور فسطائیت کے اندھیرے ڈوب جائیں گے اور ایسا نظام آئے گا جس میں انسان اور اُس کے محنتی ہاتھوں کی قدر ہوگی اُس کی بنیاد آدمیت اور بھائی چارے پر ہوگی جہاں کا ہر انسان برابر ہوگا۔ طبقاتی جھگڑے نہ ہوں گے آپس میں نفاق نہ ہوگا۔''[۱]

کرشن چندر اشتراکیت کے سنہری اصولوں کے ہمیشہ سے معترف رہے اور کوشش کرتے رہے کہ ساری دُنیا پر اشتراکی نظام رائج ہوتا تاکہ ساری دُنیا امن کا گہوارہ بن جائے۔ ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی کے بقول:

> ''کرشن چندر جنگ اور ایٹمی تخریبی قوت کے سخت مخالف ہیں اُن کا خیال ہے کہ سائنس کی روز افزوں ترقی سے نسل انسانی کی بقا کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے لہٰذا وہ جنگ کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور اُس کی جگہ عالمی امن کے متلاشی ہیں اُن کا خیال ہے کہ پوری دُنیا میں امن و امان اس وقت قائم ہوسکتا ہے اور دائمی مسرت حاصل کی جاسکتی ہے جب دُنیا اشتراکیت کے سنہرے اصولوں کو مان لے۔''[۲]

کرشن چندر مارکسی نظریات کے قائل ہیں انہوں نے اپنے ناولوں میں انہیں نظریات کو اقتصادی پس منظر میں پیش کیا ہے جس وقت کرشن چندر نے ادبی میدان میں قدم رکھا اُس وقت دُنیا ایک نئے انقلاب سے دوچار ہو رہی تھی۔ انقلاب روس کے اثرات دیگر ممالک پر بھی پڑنے لگے تھے جنگ کی وجہ سے دُنیا کی اقتصادی حالت بگڑتی جا رہی تھی افراطِ زر کی وجہ سے طبقاتی کشمکش بڑھتی جا رہی تھی۔ محنت کش طبقے میں جاگیردارانہ نظام اور سرمایہ داری کی وجہ سے فنکار نے اپنے ناولوں میں انہیں اقتصادی مسائل پس منظر کے روپ کے طور پر پیش کیا وہ اپنے فن کے ساتھ کتنے مخلص تھے اس کی ایک تصویر ڈاکٹر حیات افتخار نے کچھ یوں پیش کی ہے:

> ''انہوں نے اپنے نقطۂ نظر اور سیاسی مسلک سے جس طرح ایمانداری برتی ہے اور جس فنکارانہ خلوص کے ساتھ پیش کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے انہوں نے ادب کو صحیح معنوں میں برائے عوام پیش کیا اور اشتراکی اور ترقی پسند خیالات کی تبلیغ مؤثر طریقے سے کی ہے۔''[۳]

اپنے ناولوں کے ذریعے کرشن چندر نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ وہ سیاسی نقطۂ نظر سے مارکس کے ہم خیال ہیں وہ انسان کے ہاتھ سے بندوق چھین لینا چاہتے ہیں اور اُسی کے ہاتھ میں پھول دے دینا چاہتے ہیں جو کہ امن و آشتی کا نشان ہے سماج میں ایسے انقلاب کے متمنی ہیں جہاں انسان انسان سے نفرت نہ کرے گویا کرشن چندر انسان دوستی کی راہ سے اشتراکیت کی

طرف آئے، مارکسزم کا مطالعہ کیا اور اُس سے متاثر ہوئے یہاں تک کہ ترقی پسند تحریک سے پوری طرح وابستہ ہو گئے۔
اس حوالے سے خود ہی کہتے ہیں:

> ''جس طرح کوئی خیال جذو ایمان بن جاتا ہے اسی طرح اشتراکیت نے مجھے اِس حد تک متاثر کیا ہے کہ وہ میرے بنیادی عقائد کا مرکز بن گئی اور میری حیات کا سب سے روشن پہلو...... میں آج بھی اشتراکیت کے راستے پر اپنی سوجھ کے مطابق چلتا ہوں، کام کرتا ہوں اور لکھتا ہوں لیکن اس کا اندھا مقلد نہیں ہوں۔''[۴]

'شکست' کرشن چندر کا پہلا ناول ہے اس میں دو کہانیاں ایک دوسرے کے متوازی چلتی ہیں ایک طرف شیام اور ونتی ہیں شیام باغیانہ اور انقلاب پسند خیالات کا حامل ہے اور وہ فرسودہ اور بوسیدہ معاشرے کو بدل کر رکھ دینا چاہتا ہے لیکن اس میں عملی نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی سکت نہیں ہے اس کی یہی بے ہمتی اسے ایک انفعالی کردار بنا دیتی ہے۔ شیام ونتی سے محبت کرتا ہے اور ونتی بھی اس پر جان چھڑکتی ہے لیکن جب شیام کے والدین اس کی رضا و رغبت کے بغیر کسی اور لڑکی سے شادی طے کر دیتے ہیں تو وہ راستے سے ہٹ جاتا ہے پھر ونتی کی شادی جب ایک مجہول سے لڑکے سے کر دی جاتی ہے تو وہ بھی کسی شدید ردِعمل کا اظہار نہیں کرتی اُدھر جب ونتی کو شیام کی شادی کی خبر ملتی ہے تو وہ اپنی جان دے دیتی ہے۔

دوسری طرف چندرا اور موہن سنگھ کی محبت کی داستان ہے چندرا کو اپنے اچھوت پن اور غربت کا احساس ہے لیکن وہ اپنی باطنی توانائی سے اِس احساس پر قابو پا لیتی ہے جبکہ موہن سنگھ راجپوت خاندان کا کھاتا پیتا نوجوان ہے چندرا خوب جانتی ہے کہ گاؤں والوں کو اُن کی محبت ایک آنکھ نہیں بھاتی اور وہ کبھی اُسے پنپنے نہ دیں گے اسے یہ بھی خدشہ ہے کہ اس کی ماں بھی اس محبت کی مخالفت کرے گی لیکن وہ بڑے دل گردے کی حامل ہے نہ وہ گاؤں والوں کے سامنے جھکتی ہے اور نہ ماں کو خاطر میں لاتی ہے، نہ سماج کے ٹھیکیداروں کی پروا نہیں کرتی ہے لیکن موہن سنگھ کے غیر متوقع حادثے کی وجہ سے اُس کا حوصلہ پست ہو جاتا ہے اور اسے اپنی بے بسی اور کسمپرسی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

'شکست' اپنے عہد کی سیاسی طبقاتی اور مذہبی اقدار سے بغاوت کا نام ہے اس میں درد بے چینی پوری طرح سما گئی ہے۔ 'شکست' میں ایک بیمار اور افسردہ نظام کے مقابلے میں صحت منداور توانا امنگوں کو پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی نے پوری تصویر کو واضح کر دیا ہے:

> ''اِس ناول میں سرمایہ دارانہ نظام اور مذہبی ٹھیکیداروں پر سخت طنز کیا گیا ہے جو قبل آزادی پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں رکھا تھا اِس ناول میں دو کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں ایک ہیروشیام جو تحصیل دار کا لڑکا ہے اور اُس کی محبوبہ ونتی ایک ایسی عورت کی لڑکی ہے جس کو سماجی ٹھیکیداروں نے سماج سے نکال دیا ہے انہوں نے شیام کے کردار میں اُس دور کے نوجوان کو پیش کرنے کی کوشش ہے جو اشتراکی ہے جو سماج سے بغاوت کرنا چاہتا ہے مگر اُس میں اتنی ہمت نہیں ہے۔''[۵]

ڈاکٹر حیات افتخار نے ناول کے مجذوب کرداروں کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ خاص طور پر مرکزی کردار شیام کے عمل پر وہ بہت کڑھتے ہیں:

''شکست' کا مرکزی کردار شیام ہے جو اشتراکی خیالات کا حامل تو ہے لیکن اُس کے خیالات جتنے باغیانہ اور انقلاب پسندانہ ہیں وہ عمل کے میدان ہی اتنا ہی کورا ہے دراصل شیام کے روپ میں کرشن چندر نے اُس دور کے نوجوان کی تصویر پیش کی ہے جو سماج کو بدل ڈالنے کی خواہش تو رکھتا ہے لیکن اُس سلسلے میں کوئی عملی قدم اُٹھانے کی اپنے میں ہمت نہیں پاتا۔''[۶]

کرشن چندر ہمیشہ سے ایسے نظام کے خواہش مند تھے جو انسان دوستی پر مبنی ہو وہ چاہتے تھے کہ محبت نظام عالم کو اپنے قبضے میں لے لے کیونکہ بقیہ سارے ازم فیل ہو چکے ہیں۔شیام سوچتے ہے:

''حکومت چاہے وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو جبر واستبداد کے بغیر ایک لمحہ جی نہیں سکتی۔ یہ حکومت جمہوری ہو یا اشتراکی ہو جبر وتشدد اُس کی بنیاد ہے لیکن، کیا ضروری ہے کہ حکومت ہو، کیا انسان کی زندگی حکومت کے بغیر بسر نہیں ہو سکتی، کیا ابھی تک انسان کو خوف کا احساس دلائے بغیر اس سے کوئی اچھا کام کروایا جا نہیں سکتا۔''[۷]

'جب کھیت جاگے' میں کرشن چندر نے ۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۱ء کے دوران میں تلنگانہ کے کسانوں کی انقلابی جدوجہد کو موضوع بنایا ہے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک پورے برصغیر میں آزادی وانقلاب کی تحریک اپنے جوبن پر تھی اس صورتِ حال میں راگھو راؤ کی قیادت میں تلنگانہ کے کسان بقائمی ہوش وحواس، جوش وجذبہ سے منظّم ہو کر نظامِ شاہی سمیت، جگن ناتھ ریڈی اور پرتاب ریڈی جیسے جاگیرداروں کے ظلم کا پرچم سرنگوں کرتے ہیں اپنی زمینیں زمینداروں کے قبضے سے آزاد کراتے ہیں۔ راگھو راؤ از روئے انصاف سب کو اراضی میں برابر کا حصہ تقسیم کرتا ہے یہ جشن کا موقع تھا جب حیدر آباد کی کانگریسی حکومت کی فوج کو لے کر سابق جاگیرداروں نے یلغار کر دی۔ بری رام پور کا علاقہ از سرِ نو مقبوضہ ہو گیا سینکڑوں بچے، بوڑھے، عورتیں، مرد موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے راگھو راؤ کو گرفتار کر لیا گیا۔ اگلی صبح پھانسی ہونے والی ہے اور آخری رات پوری زندگی کے معنی خیز واقعات اسے یاد آ رہے ہیں پورا ناول انہی یادوں پر مبنی ہے۔

راگھو راؤ کا باپ ویریا اُس کے لیے سب کچھ تھا ماں باپ، بہن بھائی اور یار دوست۔ یہ وٹی لوگ تھے جن کی زمینیں ہی نہیں ان کی زندگیوں پر بھی زمیندار قابض تھا غلامی اور مشقت ہی اُن کے حصے میں آئے تھے مگر باپ بیٹا گاؤں کے میلے میں شریک ہو گئے۔ راگھو راؤ نے نیا کرتا بھی پہنا ہوا تھا۔ جاگیردار کے کارندوں نے نیا کرتا پھاڑ دیا زدوکوب کرتے ہوئے حکم دیا کہ وہ بیگار کے لیے چلیں۔ راگھو راؤ نے تکرار کی تو باپ نے اسے تھپڑ رسید کیا۔ راگھو راؤ کو اپنی محبوبہ چندری یاد آتی تھی جلد ہی اُس کا رومانس ختم ہو گیا جب اُس نے دیکھا کہ چندری زمیندار کے دستِ ہوس میں ہے۔ غصے میں اُس کے چندرا کو فاحشہ کہا۔ چندرا نے تردید کی۔ زمیندار کو وہ سینے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتی کہ یہ اُس کے بچے کے لیے وقف ہے اُس جواب نے راگھو راؤ کو حقیقت پسند بنا دیا۔

'جب کھیت جاگے' کا موضوع دراصل تلنگانہ کی کسان تحریک ہے جس میں جاگیردارانہ نظام کو ختم کر کے ایک نیا نظام قائم کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن کسان کی اس جدوجہد کو ختم کرنے میں جاگیرداروں کے ساتھ اس وقت کی کانگریس حکومت نے بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور ہر طرح کا ظلم روا رکھا اور اُن کے آگے بڑھتے ہوئے انقلابی قدموں میں زنجیریں پہنا

دیں لیکن انسان کے خیالات کو اسیر کرنا ممکن نہیں ہے۔ روشنی کی کرنوں کو قید نہیں کیا جا سکتا۔
ڈاکٹر افتخار رقمطراز ہیں:

> ''اس ناول میں جاگیردارانہ طبقے کے خلاف کسانوں کی جدوجہد کی تصویر پیش کی گئی ہے جو کوئی خیالی تصویر نہیں ہے بلکہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کا موضوع دراصل تلنگانہ کی کسان تحریک ہے جس میں جاگیردارانہ نظام کو ختم کر کے ایک نیا نظام قائم کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن کسانوں کی اِسی جدوجہد کو ختم کرنے میں جاگیرداروں کے ساتھ اُس وقت کی حکومت نے بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا اور ہر طرح کا ظلم روا رکھتے ہوئے اُن کے آگے بڑھتے ہوئے انقلابی قدموں میں زنجیریں پہنا دیں۔''[۸]

اس ناول کی بنیاد ہی طبقاتی کشمکش پر رکھی گئی ہے جس کے مطابق نہ صرف ہمارے دور میں بلکہ ہر دور میں طبقاتی کشمکش کا وجود رہا ہے یہ کشمکش اور جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک دُنیا میں طبقاتی سماج کا وجود باقی ہے یہ کشمکش دو طبقوں بورژوا جو سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور زمینداروں پر مشتمل ہے اور دوسرا پرولتاری جو مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں پر مشتمل ہے یہ طبقے آپس میں برسرِ پیکار ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد ناول کے موضوع تلنگانہ تحریک پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اِس کہانی کے پیچ وخم میں اُترئے تو واضح ہو جاتا ہے کہ کرشن چندر تلنگانہ کے غریب مزدوروں اور کسانوں کی جدوجہد کو محنت کشوں کی ہندوستان گیر بلکہ عالم گیر جدوجہد کا استعارہ بنا دیا ہے۔ کسان، مزدور اور محنت کش ہر جگہ سرمایہ داری کے اسیر ہیں اور انہیں اپنی محبت کا اتنا بھی معاوضہ نہیں ملتا کہ بھر پیٹ کھا سکیں اور اچھی طرح بدن ڈھانپ سکیں۔ سویت یونین کے انقلاب کے بعد کسانوں میں منظّم جدوجہد کا طریقہ جگہ بنانے لگا تو زمینداروں نے نظام کے ساتھ مل کر استحصال کے نئے راستے نکالے پھر کانگریس کی حکومت قائم ہوئی تو مزدوروں کے دل میں نئی کرن جاگی مگر کانگریس کے رہنما بھی زمینداروں اور جاگیرداروں کا ہی ساتھ دینے لگے اور محنت کشوں پر اشتراکیت کا لیبل لگا کر انہیں خواہ مخواہ پریشان کیا جانے لگا۔''[۹]

راگھو راؤ سوریا پیٹ سے حیدرآباد چلا آتا ہے جہاں اسے مقبول ملتا ہے۔ 'جب کھیت جاگے' کا سب سے اہم کردار راگھو راؤ ہے اس کے کردار میں توازن ہے۔ وہ ہندوستان کے اور مزدور کے معاشی استحصال پر بہت تلملاتا ہے اور انقلابی شعور اُس کے اندر موجزن ہے۔ راگھو راؤ کی جب مقبول سے ملاقات ہوئی تو راگھو راؤ کے خیالات اور بھی پختہ ہو گئے:

> ''پھر وہ سوریا پیٹ سے حیدرآباد چلا آتا ہے اور رکشا چلانے لگتا ہے اِسی دوران اُس کی ملاقات مقبول سے ہوتی ہے اور یہیں اُس کے خیالات ونظریات میں انقلاب آنے لگتا ہے بلکہ دوسرے الفاظ میں انقلابی شعور کی تربیت ہوتی ہے۔ مقبول کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ مزدوروں کی ٹریڈ یونین ہوتی ہے جہاں اُن کے مطالبات کو منوایا جاتا ہے۔''[۱۰]

کرشن چندر نے غریب مزدوروں اور کسانوں کی جدوجہد کو پوری دُنیا کے محنت کشوں کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔

سردار جعفری 'جب کھیت جاگے' کے اس پہلو کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جب کھیت جاگے' اس اعتبار سے کرشن چندر کی سب سے اہم کہانی ہے کہ اِس میں پندرہ سولہ سال کے بعد وہ کسان نئی شان سے واپس آتا ہے جس نے انتہائی بے چارگی کے عالم میں پریم چند کے ناول ''گئو دان'' میں دم توڑا تھا۔''[۱۱]

''جب کھیت جاگے'' کرشن چندر کے فکر وفن کے ارتقائی سفر میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ تلنگانہ تحریک اور طبقاتی کشمکش کے موضوع پر لکھا گیا یہ ناول رومانیت سے حقیقت نگاری کی طرف ایسا سفر ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بظاہر اِس کا موضوع محدود ہے مگر وسیع تر معنی کی تلاش کی جائے تو یہ ناول محنت کشوں اور زمینداروں کی ہندوستان گیر لڑائی کو سمیٹتا نظر آتا ہے وہی سازشیں وہی نفرتیں اور صعوبتیں جو مزدوروں اور جاگیرداروں کی کشمکش میں ہر جگہ دکھائی دیتی ہیں یہاں بھی موجود ہیں۔ مارکسزم کا فلسفہ جس سے ترقی پسندی کا خمیر اُٹھا ہے اُس کی بنیاد ہی طبقاتی کشمکش پر استوار کی گئی ہے یہ کشمکش دو طبقوں میں جاری ہے۔ کرشن چندر نے راگھوراؤ کے لازوال کردار کی مدد سے اِس ساری صورتِ حال کو واضح کیا ہے۔

ڈاکٹر حیات افتخار نے راگھوراؤ کے بارے میں لکھا ہے:

''کرشن چندر انسان کو تقدیر کا غلام نہیں سمجھتے بلکہ تقدیر پر قادر سمجھتے ہیں اور اِس نظریے کے قائل ہیں کہ انسان اپنی محنت سے چاہے تو دُنیا کو بدل سکتا ہے اور ایک انقلاب عظیم برپا کر سکتا ہے جیسا کہ روس میں لینن اور چین میں ماؤ نے انقلاب برپا کر کے دکھایا انہوں نے یہی کام لیکن چھوٹے پیمانے پر ناول کے ہیرو راگھوراؤ سے لیا ہے۔''[۱۲]

ناول کا ایک کردار مقبول سرمایہ داروں کے مظالم سے یوں پردہ کشائی کرتا ہے:

''اُس کھلی سازش کا وسیع سلسلہ دیکھا جو ہندوستان کے شہروں کے بڑے بڑے سرمایہ داروں سے لے کر گاؤں کے زمینداروں تک میں پھیلا ہوا تھا جس کی جڑیں زندگی کے ہر شعبے میں زہر کی لکیر کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔''[۱۳]

کرشن چندر کا ناول ''آسمان روشن ہے'' اشتراکی تصورات پر مبنی ناول ہے۔ کرشن چندر کی وہ رجائیت جو اشتراکیت سے ان کی وابستگی کا نتیجہ ہے یہاں بھرپور طریقے سے سامنے آئی ہے۔

ناول کا قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک مشہور ناول نگار اسحاق خودکشی کے ارادے سے کھنڈالہ آتا ہے۔ اس خودکشی کا سبب ایک خوبصورت عورت جمیلہ کی بے وفائی ہے وہ شراب کی ایک دعوت میں جمیلہ سے پہلی بار ملتا ہے اُس کے ساتھ دو اور عورتیں تھیں مگر جمیلہ نے اُسے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ جمیلہ کے یہاں آنے جانے لگا اور شب و روز ہنستے کھیلتے گزرنے لگے مگر اُسی دوران جمیلہ نے ایک اور مرد تلاش کر لیا اور اسحاق کو اپنی زندگی سے نکال باہر کیا اپنے سینے میں درد کا طوفان سجائے وہ کھنڈالہ آتا ہے اور پہاڑوں میں خودکشی کے لیے مناسب جگہ تلاش کرتا ہے اِس دوران اس کی ملاقات ایلیا سے ہوتی ہے اسے معلوم ہوتا ہے کہ اسحاق نے جمیلہ کو چھ دن کی مہلت دی ہے بصورت دیگر وہ خودکشی کرے گا اسی دوران اسحاق کا جھگڑا سیٹھ سے ہو جاتا ہے چونکہ وہ جنگ کا حامی اور مسلمانوں کا دشمن ہے پولیس افسر سامنت اسحاق کو جیل میں بند کر دیتا ہے مزدوروں کا ایک رہنما بھی اسی

جیل میں ہے۔ ایلسا ان دونوں کی ضمانت کرواتی ہے۔ اسحاق سے وہ زندہ رہنے کا وعدہ لیتی ہے مگر اسحاق چپ رہتا ہے۔

کرشن چندر ’آسمان روشن ہے‘ میں اپنے سیاسی نظریات کی عکاسی کرتے ہیں اُن کا سیاسی انسان یقیناً کمیونسٹ پارٹی کا رکن ہے۔ ’جب کھیت جاگے‘ تلنگانہ بغاوت کا ہیرو بنتا ہے کبھی براہم پترا میں اپنے آپ کو سیاسی پارٹی سے منسلک کرتا ہے۔ اُن کی تمام تحریروں میں ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی حمایت موجود ہے۔ ان کے یہاں ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک کہیں نہ کہیں سیاسی نظریات کی عکاسی ضرور ملتی ہے۔ وہ ملک میں انقلاب کے خواہاں ہیں مگر وہ ظاہری انقلاب کے قائل نہیں وہ کہتے ہیں انقلاب وہی ہوتا ہے جو اندر سے آتا ہے جسے اس ملک کے لوگ اپنی کوششوں سے اپنے خون سے لے کر آتے ہیں جو انقلاب باہر کی سازشوں سے لایا جاتا ہے انقلاب درآمد کرنے والی چیز نہیں ہے۔ کرشن چندر جہاں انقلاب کی بات کرتے ہیں وہاں کوشش کی بات بھی ضرور کرتے ہیں لکھتے ہیں:

> ’’انسان جہاں بھی بستا ہے اپنے ناموں مذہبوں، کلچروں اور تمدنوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں ایسی جیسی کہ وہ چاہتے ہیں انہیں گزارنے کا پورا حق ہے اور کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ کیپٹلزم کے نام پر یا سوشلزم کے نام پر یا کسی ازم کے نام پر کسی مذہبی یا ملکی مفادات کے نام پر ان کے سر پر بندوق لے کے چڑھ جائے۔‘‘[۱۴]

کرشن چندر کا سیاسی انسان دراصل انسان کے ہاتھ سے بندوق لے لینا چاہتا ہے۔

’غدار‘ کا شمار ان ناولوں میں ہونا چاہیے جو ۱۹۴۷ء کے فسادات کی براہِ راست تصویر کشی کرتے ہیں ناول ۲ اگست ۱۹۴۷ء سے شروع ہو کر تقسیمِ ہند کے کچھ دنوں بعد تک پہنچتا ہے ایسے میں تقسیمِ ہند کے فوراً بعد رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت سے متعلق واقعات خود بخود اس کا حصہ بن جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے ناقدین نے اِس ناول کا موضوع تقسیمِ ہند قرار دیا ہے۔ قصہ غیر منقسم پنجاب کے ایک دور افتادہ گاؤں کا ہے جو لاہور سے کچھ دور مگر قلعہ سوبھا سنگھ کے اسٹیشن کے قریب ہے۔ اگست ۱۹۴۷ء کی شام میں پڑوس کے گاؤں علی پور سیداں کے مسلمان فسادی اس گاؤں پر حملہ کرتے ہیں گاؤں کا مسلمان نمبردار سر بلند جس نے غیر مسلموں کی حفاظت کا وعدہ کیا ہوا تھا حملہ آوروں کی کثیر تعداد دیکھتے ہی اپنی بے بسی کا اظہار کرتا ہے بھگدڑ مچتی ہے نمبردار کی بیٹی شاداں جو ایک ہندو لڑکے بیج ناتھ سے پیار کرتی ہے کسی طرح اپنے بھائی طفیل کی مدد سے اس کو بچا کر لاہور لے آتی ہے وہاں بیج رات اپنے دوست کے یہاں گزارتا ہے پھر ٹرین سے اپنے گاؤں کوٹلی سودکاں جاتا ہے وہاں اس کے ماں باپ سب مل جاتے ہیں۔ بیج ناتھ سب کو گاؤں چھوڑنے کا مشورہ دیتا ہے مگر دادا نہیں مانتے اسی دوران تقسیم ہو جاتی ہے اکیس اگست کی شام کو دادا جی کے مسلم مزارعے ان کے پاس گاؤں آ کر اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہیں مگر دادا جی اب بھی وہاں سے نہیں ہٹتے۔ ۲۲ اگست کی صبح گاؤں پر حملہ ہوتا ہے دادا جی مارے جاتے ہیں اس حملہ آور بیج ناتھ کی بہن کو اُٹھا کر ساتھ لے جاتے ہیں وہ جان بچا کر بھاگتا ہے اور راستے بھر تباہی و بربادی، خونریزی وحشت و بربری کے کتنے ہی روح فرسا مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مذہب اور خدا کے نام پر ڈھائے جانے والے طنز کی تصویر ملاحظہ کریں:

> ’’فسادیوں کے ہاتھوں مارے گئے مسلمان نوجوان کی قبر پر اُس کا بڑھا باپ سورۂ فاتحہ پڑھتا رہا جب

قافلے والے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اُس نے سورۃ فاتحہ ختم کیا۔

الحمداللہ ربّ العالمین......

ست سری کال، ...... ہر ہر مہا دیو، ہوا میں برچھے چمکے اور بڈھے مسلمان کا جسم چار ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا مارنے والے کی زبان پر آخری نام خدا کا تھا اور مرنے والے کی زبان پر بھی خدا کا نام تھا۔

اگر مرنے والے اور مارنے والوں کے اُوپر کوئی خدا تھا تو بلاشبہ بے حد ستم ظریف تھا۔'' [۱۵]

صدیوں کی تعلیم کے بعد انسان جنگل اور جہالت کی تاریکی سے باہر نکل آیا تھا اس نے روشن افروز اور مہذب سماج کو جنم دیا تھا لیکن تہذیب کی جھلی اتنی باریک ثابت ہوئی۔ ذرا سی ٹھیس سے ادھڑ گئی اندر سے جنگلی درندوں کے غول کے غول اُمڈ پڑے۔

''ذرا سوچو تو یہ کس طرح کی حب الوطنی ہے؟ صرف اپنے وطن سے محبت کرو اور دوسرے تمام مُلکوں، لوگوں، مذہبوں، انسانوں سے نفرت کرو اور موقع ملے تو اُن کا سر کچل ڈالو۔'' [۱۶]

'ایک گدھے کی سرگذشت' ۱۹۵۶ء میں ماہنامہ 'شمع' نئی دہلی میں قسط وار چھپنا شروع ہوا پھر ۱۹۵۷ء میں اِسی ادارے کے تحت کتابی شکل میں منظرِ عام پر آیا اِس کے بعد کرشن چندر نے 'گدھے کی واپسی' اور 'ایک گدھا نیفا میں' لکھ کر اِس سلسلے کو آگے بڑھایا۔

کرشن چندر نے یہ تینوں ناول ایک ہی مرکزی کردار ''مسٹر ڈنکی آف بارہ بنکی'' یعنی بارہ بنکی ایک گدھے کی کہانی پیش کرتے ہیں چونکہ یہ گدھا ایک غیر معمولی شخصیت کا مالک ہے اور بظاہر گدھوں کی شکل وصورت رکھنے کے باوجود اُس میں آدمیوں کی خصوصیات پیدا کر دی جاتی ہیں اس لیے ہم اُن ناولوں کو بجا طور پر تمثیل کی صف میں جگہ دے کر اِن کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

بارہ بنکی کا ایک گدھا جس کا مالک دھنو کمہار ہے لکھنؤ کے سید کرامت علی شاہ بار ایٹ لا کی زیرِ تعمیر کوٹھی میں اینٹیں دھونے کا کام کرتا ہے انہیں دنوں اسے اخبار بینی کا چسکا پڑ گیا پھر یہ شوق اِس قدر بڑھ گیا کہ وہ حالاتِ حاضرہ اور ملکی سیاست کے موضوع پر وکیل صاحب کی باتیں سننے اور سمجھنے لگا لیکن اُس کی اینٹیں ڈھونے کی صلاحیت کم ہوگئی ایک دن دھنو کمہار نے اس پر چوری کا الزام لگا کر اِسے گھر سے نکال دیا اسے اُمید تھی کہ کرامت علی صاحب اس کی پذیرائی کریں گے مگر وہ فسادیوں کے ہاتھوں اپنی جان بچا کر پاکستان بھاگ چکے تھے اور اُن کی عالی شان کوٹھی پر لاہور کے رفیوجی گنڈا سنگھ نے قبضہ کر لیا تھا کتابیں سب سڑک پر پھینکی ہوئی تھیں جنھیں دیکھ کر گدھے کو علم و ہنر کی بے قدری کا احساس ہوا وہ ہندوستان کی راجدھانی دہلی کی طرف چل پڑا راستے میں کئی فسادیوں سے بچتا بچاتا دہلی پہنچ گیا اور وہاں پولیس والوں کے ہتھے چڑھ گیا وہ اسے انسانوں کی طرح باتیں کرتے دیکھ کر بہت حیران ہوئے اور پاکستانی جاسوس سمجھنے لگے عین موقع پر اس نے بولنا بند کر کے گدھے کی طرح ہانک لگانا شروع کر دی اور پولیس والوں نے اسے نیلام کر دیا۔ رامو دھوبی نے اسے خریدا اور سخت مشقت کروانے لگ گیا ایک دن جمنا کے گھاٹ پر کپڑے دھوتے دھوبی مگر مچھ کا شکار ہوگیا۔ گدھا اب آزاد تھا وہ چاہتا تو جا سکتا تھا مگر وہ شاید دوسروں سے زیادہ وفادار تھا اس نے رامو دھوبی کی بیوہ کو مالی امداد دلانے کے لیے میونسپل کمیٹی کے محرر سے لے کر کامرس کے وزیر تک ملاقات کی مگر اسے کامیابی نہ مل سکی آخر وہ موقع نکال کر وزیرِاعظم نہرو تک پہنچ گیا وہ بڑے تپاک سے ملے ملکی سیاست پر بحث کی مگر بیوہ

کے لیے کچھ کرنے سے معذرت ظاہر کی البتہ انہوں نے کچھ دیر گدھے کی سواری کی اور بیوہ کے لیے اپنی جیب سے سو روپے بھی عنایت کیے جب گدھا باہر آیا تو پریس والوں نے اسے گھیر لیا اسے بے حد شہرت ملی مقابلہ حسن کی اس کو صدارت ملی۔ ساہتیہ اکیڈمی کے ممبران سے اس کی ملاقات ہوئی ایک سیٹھ اسے اپنے گھر لے گیا اپنی حسین وجمیل لڑکی سے اس کی شادی طے کر دی کچھ دن اچھے گزرے مگر جب سیٹھ نے ٹھیکہ دلانے میں مدد کا کہا، انکار پر گدھے کے بُرے دن آ گئے سیٹھ اور اُس کی لڑکی نے اُس کا بھرکس نکال دیا۔

کرشن چندر کی اِن تمثیلوں کا جو وصف انہیں انفرادیت اور عظمت عطا کرتا ہے وہ سماجی تنقید اور احتجاج سے عبارت ہے یہاں گدھا چند اخلاقی سیاسی، سماجی قدروں کا معلم نہیں بلکہ وہ اپنے عہد اور معاشرے کی تمام تر خرابیوں اور بُرائیوں کے خلاف صدا احتجاج بلند کرتا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے بقول:

> ''کرشن چندر کی ان تمثیلوں کا جو وصف انہیں انفرادیت عطا کرتا ہے وہ سماجی تنقید اور احتجاج سے عبارت ہے یہاں گدھا صرف چند اخلاقی سیاسی یا سماجی قدروں کا معلم و مبلغ نہیں ہے بلکہ وہ اپنے عہد اور معاشرے کی تمام خرابیوں اور بُرائیوں کے خلاف ایک صدائے احتجاج بن کر سامنے آتا ہے ایسا نہیں کہ وہ جلتے ہوئے معاشرے اور منہدم ہوتی تہذیبی قدروں کا خاموش تماشائی ہے۔ وہ حالاتِ زمانہ سے متصادم ہوتا ہے سماجی ناانصافیوں، طبقاتی ناہمواریوں اور معاشی استحصال کے خلاف جدوجہد کرتا ہے۔'' ۱۷

اس ناول کا کینوس اتنا ہی وسیع وعریض ہے جتنا کہ ہمارا معاشرہ۔ کرشن چندر نے بوسیدہ معاشی نظام، بے حس، فرض ناشناس افسر شاہی، شاطر سیاست دان، حصولِ زر کے لیے نو دولتیوں کی اندھی دوڑ غرض معاشرے کے ہر پہلو کا احاطہ موجود ہے۔ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد اِس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ایک گدھے کی سرگذشت' سرا سر جمہوری نظام کے سائے میں پلتے ہوئے موجودہ معاشرے پر لکھا گیا ناول ہے جس میں افسر شاہی، نوکر شاہی، بیوروکریسی اور دفتری نظام کی ناہمواریوں کو پُر لطف انداز میں اُبھارا گیا ہے۔'' ۱۸

'ایک گدھا نیفا میں' بعض امور کی تکرار ہے مگر موجودہ معاشرے اور سیاست کے کچھ نئے پہلو بھی سامنے آئے ہیں۔ فلمی دُنیا کی ذہنیت کرشن چندر کے کئی ناولوں میں پیش ہوتی رہی ہے۔ 'گدھے کی واپسی' میں ہم پریم بالا اور دادا دھمال کے کردار اور ان کی ذہنیت کو کارفرما دیکھتے ہیں۔ دونوں حد درجہ چالاک اور خود غرض ہیں کم وبیش یہی حال ان کرداروں کا بھی ہے جو گدھے کے ساتھ شوٹنگ کے لیے جاتے ہیں جب تک وہ گدھے کو اپنے لیے فائدہ مند سمجھتے ہیں اس کو ہر شرط قبول کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ فلم کی ہیروئن اس کے عارضی طور پر غائب ہونے پر آنسو بہاتی ہے مگر جب چین کے فوجی ہندوستان چوکی پر حملہ کرتے ہیں تو سب کو اپنی اپنی پڑ جاتی ہے۔

ناول میں انسان کی مطلب پرستی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں کرشن چندر کے اشترا کی خیالات بھی نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد رقمطراز ہیں:

''ایک گدھا نیفا میں' کا مطالعہ اس اعتبار سے بے حد اہم ہے کہ اِس میں کرشن چندر کے بعض اشتراکی خیالات نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ چو۔این۔لائی کے ساتھ کرشن چندر کی ہندوستانی جمہوریت بہ نام چینی اشتراکیت پر مبنی بحث بلاشبہ دستاویزی حیثیت رکھتی ہے لیکن اُس کا مطالعہ کرتے وقت پنڈت نہرو اور گدھے کے بیچ ہونے والی گفتگو بھی ذہن میں رکھی جائے۔ پنڈت نہرو کا یہ خیال رہا کہ جمہوری عمل میں تبدیلی دھیرے دھیرے آتی ہے اور ہندوستان میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ اشتراکی کرشن چندر (بہ زبان خر) کہتے ہیں کہ یہ کام جلد ہونا چاہیے۔نہرو اِن خیالات سے اتفاق نہیں کرتے ان کا ماننا ہے کہ ہندوستانی سرزمین میں باہر کی قلم نہیں لگے گی۔''۱۹

حواشی:

۱۔ عبدالسلام صدیقی، ڈاکٹر، کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۹۵ء، ص: ۶۴

۲۔ ایضاً، ص: ۶۷

۳۔ حیات افتخار، ڈاکٹر، اُردو ناول میں ترقی پسند عناصر، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۹۱ء، ص: ۲۱۸

۴۔ ایضاً، ص: ۲۲۹

۵۔ عبدالسلام صدیقی، ڈاکٹر، کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۹۵ء، ص: ۳۲

۶۔ حیات افتخار، ڈاکٹر، اُردو ناول میں ترقی پسند عناصر، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۹۱ء، ص: ۲۲۱

۷۔ کرشن چندر، شکست، امرتسر: آزاد بک ڈپو، س۔ن، ص: ۳۴

۸۔ حیات افتخار، ڈاکٹر، اُردو ناول میں ترقی پسند عناصر، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۹۱ء، ص: ۲۳۳

۹۔ اعجاز علی ارشد، ڈاکٹر، کرشن چندر کی ناول نگاری، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۳ء، ص: ۴۹

۱۰۔ کرشن چندر، جب کھیت جاگے، کراچی: مقصود اینڈ سنز، س۔ن، ص: ۴۳۔۴۴

۱۱۔ کرشن چندر، جب کھیت جاگے، دیباچہ، سردار جعفری، کراچی: مقصود اینڈ سنز، س۔ن، ص: ۱۳

۱۲۔ حیات افتخار، ڈاکٹر، اُردو ناول میں ترقی پسند عناصر، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۹۱ء، ص: ۲۳۳

۱۳۔ کرشن چندر، جب کھیت جاگے، کراچی: مقصود اینڈ سنز، س۔ن، ص: ۷۷

۱۴۔ کرشن چندر، آسمان روشن ہے، امرتسر: آزاد بک ڈپو، س۔ن، ص: ۱۳۴

۱۵۔ کرشن چندر، غدار، لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۷۹ء، ص: ۱۳۴

۱۶۔ ایضاً، ص: ۲۴۸

۱۷۔ اعجاز علی ارشد، ڈاکٹر، کرشن چندر کی ناول نگاری، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۳ء، ص: ۷۷

۱۸۔ ایضاً، ص: ۸۵

۱۹۔ ایضاً، ص: ۸۰